ڈاکٹر تبسم کاشمیری
پروفیسر شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

محمد حسن عسکری کی تنقید: اہم مباحث

Dr Tabassum Kashmiri
Professor, Departement of Urdu
G.C University,Lahore

Criticism of Muhammad Hassan Askari: Important discussions

Muhammad Hasan Askari was a trend-setter critic in the second half of 20th century. He has had a keen eye on classical and modern Urdu literature, English and French literature at a time. He was the only Urdu critic who kept away from traditional Urdu criticism. He was an original critic in his behaviour and thoughts. His criticism did not cover only literary criticism but aslo the criticism of civilization and culture, theology and spiritualism.He Reviewed the literature with incredibly broad critical vision. In this article it is tried to discuss the different aspects of his criticism.

پیدائش: نومبر ۱۹۱۹ء، میرٹھ کے قصبے ''سراوہ'' میں۔ ایم اے انگلش ۱۹۴۲ء الہ آباد یونیورسٹی، ہندوستان میں تدریس کا کام، افسانے لکھے (مجموعہ: جزیرے، ۱۹۴۳ء)، بطور نقاد مشہور ہوئے۔ 'ساقی' دہلی میں 'جھلکیاں' لکھتے رہے۔ نومبر ۴۷ء میں لاہور آمد۔ منٹو، آفتاب احمد خاں، یوسف ظفر، احمد ندیم قاسمی، انتظار حسین سے دوستی۔ تراجم اور اردو ادب۔ بعد ازاں مختصر مدت کے لیے 'ماہِ نو' کے مدیر مقرر ہو کر کراچی آنا۔ (۱۹۵۰ء) کے بعد کا لمبا دور، اسلامیہ کالج کراچی سے تعلق۔ ۱۹ جنوری ۱۹۷۸ء کو وفات۔

ادبی کارنامے:

۱۔ انسان اور آدمی، مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء (پہلا تنقیدی مجموعہ)
۲۔ ستارہ یا بادبان، مکتبہ سات رنگ، ۱۹۶۳ء (دوسرا مجموعہ)
۳۔ وقت کی راگنی، مکتبہ محراب، لاہور، ۱۹۷۹ء
۴۔ جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ، راولپنڈی، ۱۹۷۹ء

۵۔ جھلکیاں (ساقی میں لکھے کالم)، مکتبہ الروایت، لاہور، ۱۹۸۱ء
۶۔ تخلیقی عمل اور اسلوب، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۹ء
۷۔ مجموعہ۔ محمد حسن عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۴ء
۸۔ مقالات محمد حسن عسکری (دو جلدیں)، علم وعرفان لاہور، ۲۰۰۱ء

محمد حسن عسکری بیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک عہد ساز نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ بیک وقت اردو کے کلاسیکی اور جدید ادب، انگلش اور فرانسیسی ادب پر گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ اردو کے واحد نقاد تھے جو روایتی اردو تنقید سے دور رہے۔ سوچ اور فکر کے اعتبار سے وہ اوریجنل نقاد تھے۔ جدید اردو تنقید کے نقاد بالعموم دانش گاہوں کی درسیات کے نقاد رہے ہیں۔ دانش گاہی تنقید بہت محدود تنقیدی افق تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اردو کے ترقی پسند نقادوں کی تنقید Dogmatic تھی۔ یعنی ان کی تنقید کا دائرہ کار ترقی پسند و مارکسی تنقید ہی کے گرد چکر لگا سکتا تھا۔ اسی طرح سے سن پچاس کے ادھر اُدھر حلقہ ارباب ذوق کا معروف تنقیدی دبستان یورپ کی نئی تنقید اور نفسیاتی تنقید کا استعمال کر رہا تھا۔ بلاشبہ اس تنقید سے اردو تنقید میں تجزیہ، تجربہ اور سوچ کی نئی روشنی پھیلی تھی اور اردو تنقید کا افق وسیع ہوتا گیا تھا۔ محمد حسن عسکری ان تحریکوں یا دبستانوں سے بالکل مختلف نقاد تھے۔ وہ دانش گاہوں کی درسی تنقید کے پاس بھی نہ پھٹکتے تھے کہ یہ تنقید ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ ان کی سوچ اور فکر کا پھیلا ہوا افق تنقید کے چھوٹے سے روایتی دائرے میں اپنے آپ کو کس طرح سے مقید کر سکتا تھا۔ ان کے تنقیدی مزاج کی اوریجنلیٹی اس کے قریب بھی نہ جا سکتی تھی۔ اسی طرح وہ آغاز ہی میں ترقی پسند تحریک اور اس کے ادب سے متفق نہ تھے۔ وہ اس تحریک کے فکری وفنی اور ادبی جبر کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ وہ فکری طور پر ادب میں کسی قسم کی گروہ بندی یا نظریے کے جبر اور ہر قسم کی ادبی منصوبہ بندی کے سخت خلاف تھے۔ اس لیے پوری زندگی ادب کی ترقی پسند تحریک کے خلاف لکھتے رہے۔

ان کی تنقید کا ذہنی پس منظر مغرب کے بہترین اذہان، مشرقی جمالیات اور نقد کے تصورات سے مرتب ہوا ہے۔ ان پر عمر بھر فرانسیسی تنقید اور ادب کا غلبہ رہا۔ وہ اپنے ادبی تصورات کی توضیحات کے لیے بالعموم فرانسیسی شعراء اور ناول نگاروں کے نمونے پیش کرتے رہے ہیں۔ 'فن برائے فن' والے طویل مضمون میں بودیلیئر، راں بو اور پال ورلین کو انھوں نے بکثرت استعمال کیا ہے۔ وہ ادب وفن کے نئے دور کی آگاہی کی مثالیں پیش کرنے کے لیے بار بار مغربی ادب سے رجوع کرتے ہیں۔ مغربی ادب سے ان کے عشق کا عالم یہ تھا کہ اپنے لیکچروں میں وہ اس بات پر فخر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ:

> ''میرے ادبی دیوتا تو آج بھی وہی ہیں جو ہمیشہ سے تھے اور بودیلیئر، میلارمے، راں بو، پاؤنڈ، فلوبیئر، جوائس اور لارنس کی عظمت کا میں پہلے سے بھی زیادہ قائل ہوں۔ بلکہ میرا عقیدہ ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب میں جو چیز سب سے زیادہ عزت اور احترام کی مستحق ہے وہ ان لوگوں کا تخلیق کیا ہوا ادب ہے۔''(۱)

ان کی تنقید کا عرفان صرف مغربی دانش ہی سے مستعار نہیں ہے، وہ مشرق کی کلاسیکی دانش، تفہیم شعر اور تنقیدِ ادب کے کلاسیکی تصورات سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں مشرق کی روحانیات اور عرفانِ ذات سے طلوع ہونے والی بصیرت کے نمونے بھی ملتے ہیں اور وہ جدید تنقیدی تصورات کی تفسیر مذکورہ حوالوں سے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان کی تنقیدی شخصیت مشرق ومغرب کے امتزاج کا نتیجہ تھی۔ علم کا عرفان جہاں کہیں سے بھی ملا، حاصل کیا گیا ہے۔ کبھی کبھی بلکہ اکثر اوقات ان کی تنقید پر مغرب کا غیر ضروری یا ناقابلِ برداشت بوجھ بھی محسوس ہوتا ہے جو قاری کو پریشان کر دیتا ہے۔ اس لیے ایسے موقعوں پر ان سے اتفاق کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اسی طرح سے ادبی یا تہذیبی مسائل میں مذہبی یا روحانی تصورات کی آمیزش اور ان کی تفسیر بھی غیر ضروری محسوس ہوتی ہے۔ شاید وہ ادب میں مغربی تصورات کے ساتھ ساتھ مشرق

کے روحانی افکار کو پیش کر کے مجموعی سوچ کو متوازن کرنا چاہتے تھے۔ راں بو پران کا یہ بیان دیکھیے:

''راں بو کو تو تمام فطری اور ماورائے فطری اسرار و رموز معلوم کرنے کی ایسی لگن تھی کہ دل میں ہر وقت آگ بھڑکتی رہتی تھی۔ اس نے اپنے دو خطوں میں ایک باقاعدہ نظریہ پیش کیا ہے کہ شاعر کو عارف بھی ہونا چاہیے۔ اس میں یہ اہلیت ہو کہ وہ ہر چیز کی تہہ تک دیکھ سکے اور مستقبل کا نظارہ بھی کر سکے۔ اس عارف کا ایک خاص فریضہ یہ ہے کہ اپنے اندر جو ماورائے عقل قوتیں موجود ہیں ان کی مدد سے خارجی حقیقت کا نقاب چاک کر دے اور اس پردے کے پیچھے جو ازلی نور ہے، وہاں تک پہنچ جائے۔ اس کی رائے میں سب سے پہلا عارف بودیلئر تھا۔ راں بو کہتا ہے کہ آئندہ سے شاعری عمل کے ساتھ ساتھ نہیں چلے گی بلکہ آگے رہے گی۔ آگے رہنے کا مطلب یہ نہیں کہ شاعر عمل سے بے نیاز ہو کر فکرِ مطلق میں ڈوب جائے گا۔ راں بو شاعر کو آسمان سے آگ چرانے والا بتاتا ہے۔ یعنی شاعر جن حقیقتوں کی بے نقاب کرے گا وہ صرف جمالیاتی تسکین کے کام نہیں آئیں گی بلکہ ان سے انسان کی زندگی بدلے گی اور بہتر شکل اختیار کرے گی۔''(۲)

''یہ تو ٹھیک ہے کہ اصل مقصد زندگی کو بدلنا ہے مگر جب نسخہ کا تو پتہ ہی نہیں تو مہوس کے لیے یہی رہ جاتا ہے کہ جو چیز بھی ہاتھ آئے اسے آزمالے۔ یہ تلاش فنکار کی جان کو اس طرح لگی ہے کہ اسے کسی چیز کا ڈر ہی نہیں۔ بودیلئر نے اس جستجو کی نوعیت دو لائنوں میں بیان کر دی ہے: 'غار کی تہہ میں کود پڑو، چاہے وہاں جنت ہو یا جہنم۔۔۔۔ نامعلوم حقیقت کی گہرائیوں میں، تا کہ کوئی نئی چیز ہاتھ آسکے'۔ اور یہ غار کون سا ہے؟ خود فن کار کی ہستی۔ مگر ان لوگوں کے لیے اپنے غوطہ لگانے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ یہ لوگ اپنے ذاتی تجربات کے ذریعے دیکھ چکے تھے کہ خارجی زندگی کی ترتیب و تنظیم سے روحانی انتشار، عدم توازن اور کرب ختم نہیں ہوتا بلکہ مایوسی کچھ اور شدید ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اپنے اندر ڈوب کر یہ لوگ تجربہ کرنا چاہتے تھے کہ آخر ہماری داخلی زندگی میں بے ترتیبی کی وجہ کیا ہے؟ اس کی تنظیم ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر ہو سکتی ہے تو کس اصول کے تحت۔ اس اصول کا مقصد یہ نہیں تھا کہ خارجی دنیا سے تو لطف لے چکے اب ذرا اپنی ہستی سے دل بہلاؤ۔ بلکہ ان لوگوں کا مقصد اپنی زندگی کا معروضی مطالعہ تھا۔ لافورگ نے سفر کے معنی ''اپنے اندر اتر جانا'' بتائے ہیں۔ اور ساں پول رونے ''اس طرح چلنا کہ آنکھیں اندر کی طرف لگی ہوں۔''(۳)

محمد حسن عسکری کی تنقید صرف ادبی تنقید کے مسائل تک ہی محدود نہ تھی۔ ان کی تنقیدی ساخت، ادب، تہذیب و ثقافت، مذہبی کلچر اور روحانیات کا آمیزہ تھی۔ وہ ادب کو ایک بڑے تنقیدی وژن میں دیکھتے تھے۔ جہاں یہ ساری چیزیں تاریخ، تہذیب اور ادب کے مرکب عمل سے گزر کر اپنا ادبی وجود بناتی تھیں۔ عسکری صاحب ان معنوں میں نقاد نہ تھے کہ جن معنوں میں آلِ احمد سرور، سید عبداللہ، کلیم الدین احمد یا ممتاز حسین نقاد تھے۔ یہ حضرات ادبیات کے نقاد تھے جبکہ محمد حسن عسکری کثیر الجہت بصیرت رکھنے والے انسان تھے۔ ان کی تنقید بصیرت افروزی کے سامان مہیا کرتی تھی اور ان کا قاری ان کی فکر انگیز تحریروں سے بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا۔ اردو کے نقادوں کا کام تشریح و توضیح، تفہیم یا تفسیر کی منزل پر ہی ختم ہو جاتا تھا اور عسکری صاحب کا کام ان منزلوں سے ذرا منزل پر شروع ہوتا تھا۔ اردو تنقید کے میدان میں انھوں نے جس کثیر الجہت تنقید کا آغاز کیا تھا وہ ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا تھا۔ انھوں نے جس فکر انگیز اور بصیرت افروز تنقید کی روایت قائم کی تھی وہ بھی ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ ادب کو بین الاقوامی تناظر میں رکھ کر دیکھنے کا جو سلسلہ انھوں نے شروع کیا تھا وہ بھی ان کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔

محمد حسن عسکری کی تنقید کا ایک اہم حصہ تنقید اور اس کے فرائض کے بارے میں بھی بحث کرتا ہے۔ تنقید کے اس فریضہ کے بارے میں سب سے پہلے انھوں نے چند بنیادی سوال اٹھائے ہیں اور ان سوالوں کے جواب میں ان کی تنقیدی

سوچ تنقید کے فریضے کا کچھ تعین بھی کرتی ہے۔ان مباحث کا پہلا حصہ تنقید کے فریضے کے بارے میں یہ سوال پیدا کرتا ہے:

آخر تنقید کا فریضہ کیا ہے؟

i۔کیا ادب پاروں کو سمجھنا ہے؟

ii۔کیا ان کی قدر و قیمت کا تعین کرنا ہے؟

iii۔تخلیق کے عمل کی تفتیش کرنا ہے؟

ان نکات کا ذکر کرنے کے بعد وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

''تنقید کا فریضہ کیا ہو اور کیا نہ ہو اس سلسلے میں کوئی مطلق اور مجرد قسم کا قانون نہ تو بنایا جا سکتا ہے اور نہ بنانا چاہیے۔ اس کا انحصار تو دراصل زمان و مکاں کی مخصوص کیفیت پر ہے۔''(۴)

عسکری یہ سمجھتے ہیں کہ تنقید کے فریضے کا تعلق اپنے زمانے سے ہونا چاہیے۔اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ تنقید بجائے خود کوئی مطلق اور مستقل حیثیت نہیں رکھتی۔تنقید کے متعلق انھوں نے پہلی بات تو یہ کی ہے کہ اس کا انحصار دراصل زمان و مکان کی مخصوص کیفیت پر ہے۔اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ ہر دور کا ادب مخصوص تہذیبی تقاضوں اور مخصوص ادبی روایات سے جنم لیتا ہے اور اس ادب کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے تنقید کے مخصوص طریقہ کار کی ضرورت ہوتی ہے۔جیسے کہ سن ۳۶ء کے ادب کا جائزہ لینے کے لیے تاثراتی یا جمالیاتی تنقید کارگر نہیں ہوسکتی ہے۔اس مقصد کے لیے ترقی پسند تنقید پیدا ہوئی اور یہی زمان و مکاں کی مخصوص کیفیت کا مظہر تھی اور اسی تنقید نے ترقی پسند ادب کی تحسین و تفسیر کی۔

ایک ایسے دور میں جب ادب جمود کا شکار ہو جائے تو تنقید کا فریضہ مختلف ہو جاتا ہے۔ایسے موقعوں پر تنقید، ادب کو از سرِ نو زندہ یا بحال کرنے کے لیے یا ادب کی حیاتِ نو کے لیے کچھ سوال اٹھاتی ہے۔مثلاً یہ کہ ہمارے ادیب لکھ کیوں نہیں سکتے؟ کون سے خوف ناک تجربات ہیں جنھیں وہ لاشعور کی تہوں میں چھپائے بیٹھے ہیں؟ آخر ادیبوں میں قوتِ حیات اور قوتِ نمو کیوں کم ہو گئی ہے؟ اور وہ اس حالت پر قانع کیوں ہیں؟ ان سوالات کی توضیح، تفسیر اور تفتیش سے جو نتائج سامنے آئیں گے ان سے ادب کو متحرک کیا جا سکتا ہے۔

تنقید کے ساتھ عسکری صاحب نے نقاد کے منشا کی بھی باتیں کی ہیں۔مثلاً وہ کہتے ہیں: ''اگر کوئی نقاد کسی فن پارے سے لطف اندوز ہونے میں واقعی کامیاب ہو گیا اور اس نے اس فن پارے سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہمارے اندر بھی پیدا کر دی تو وہ بڑی حد تک اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو گیا۔'' عسکری صاحب نقاد سے کچھ اور توقعات بھی رکھتے ہیں کہ وہ اپنے تنقیدی عمل سے پڑھنے والے کے اندر کچھ تبدیلیاں بھی پیدا کرے۔مثلاً بقول عسکری: ''میں نقاد میں سب سے پہلے یہ ڈھونڈتا ہوں کہ وہ ادب کے لیے ہمارے اندر جوش و خروش پیدا کرتا ہے یا نہیں؟ جو فن پارہ اس کا موضوع ہے اس نے نقاد کے اندر Thrill پیدا کیا ہے یا نہیں؟ اور نقاد یہ Thrill ہم تک یعنی قاری تک پہنچانے میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے؟''

عسکری نے یہاں نقاد اور تنقید کے جس فریضے کا ذکر کیا ہے اس فریضے کو ادا کرنے والا تاثراتی نقاد اور تنقید کو تاثراتی تنقید کہہ سکتے ہیں۔مجموعی طور پر یہ جمالیاتی اور تاثراتی تنقید کا امتزاجی نظام ہے اور یہی نظام عسکری صاحب کی تنقید میں اساس/بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

عسکری کی تنقید روایتی تنقید نہ تھی۔وہ ان معنوں میں نقاد نہ تھے کہ جن معنوں میں فراق، وقار عظیم، کلیم الدین، عبادت بریلوی اور سید عبداللہ تھے۔یہ حضرات عملی نقاد تھے، نظریہ ساز نقاد نہ تھے۔ان لوگوں نے بہت کم ادب اور تنقید میں نظریہ سازی کا کام کیا ہے۔ان کی تنقید مختلف شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں کے تحلیل اور تجزیے پر مشتمل ہے جبکہ عسکری صاحب نے اس نوعیت کا کام بہت کم کیا ہے۔ان کی تنقید کسی نہ کسی شکل میں کسی ادبی یا تنقیدی رجحان، کسی ادبی جہت، کسی

نظریے کی توضیح وتفسیر یا کسی ادبی تصور کی روئیداد پر مشتمل ہوتی ہے۔اور ان سب چیزوں میں مشترک بات یہ ہے کہ پرانے تصورات کو دہراتے نہیں ہیں۔نقادوں کے بیان کردہ رویوں پر نہیں چلتے ہیں۔مروجہ تنقیدی نظریات کے پیرو نہیں ہیں۔مروجہ تنقیدی افکار کی معاونت پر انحصار نہیں کرتے بلکہ تنقید میں اپنی اوریجنل اور منفرد صلاحیت کو استعمال کرتے ہیں۔وہ تنقید میں تخلیقی فکر رکھنے والے نقاد ہیں۔ان کی بیشتر تنقید اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس تنقید کے تصورات پہلی بار بیان کیے گئے ہیں۔اس لیے ان کے تنقیدی افکار میں جو اوریجنلٹی ملتی ہے وہ اردو کے کسی دوسرے نقاد کے ہاں نظر نہیں آتی ہے۔انہوں نے ادب، تنقید، ہیت، تہذیب، آرٹ، مذہب، اخلاقیات، روحانیات اور ادبی جمالیات پر جو باتیں کیں، وہ ان کے زرخیز ذہن کا نتیجہ تھیں اور اردو ادب میں اس سے قبل اتنی خیال افروزی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تھا۔اردو ادب میں پہلی بار اس سطح پر باتیں کی گئی تھیں۔

اردو تنقید پر انہوں نے بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ان کے تنقیدی شعور اور ادبی افکار نے معاصرین کو بہت متاثر کیا۔ایک زمانے میں تو عسکری کی تنقید کا ایک دبستان وجود میں آ گیا تھا۔جس میں سلیم احمد، انتظار حسین، سجاد باقر رضوی اور دیگر نقاد شامل تھے۔دورِ حاضر کے ایک اہم نقاد شمس الرحمان فاروقی بھی ان کے پیروکار رہیں۔ان کی تنقید اردو ادب کی زندہ رہنے والی تنقید ہے۔

عسکری صاحب جمالیاتی تنقید کا بہت ذکر کرتے ہیں۔وہ جمالیات کو کسی فن پارے کی حقیقی روح قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک تنقید ایک وجدانی کیفیت / تجربے کا اظہار بھی ہے جو کسی ادب پارے کی خواندگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔تنقید کے بارے میں ان کی یہ رائے مشہور ہے کہ ''تنقید کا یہ فرض ہے کہ ہمیں ادب سے لطف لینا سکھائے۔'' (۵) اس حوالے سے انہوں نے یہ سوال کیا ہے کہ کیا نئی تنقید، نفسیاتی تنقید اور عمرانی تنقید وغیرہ یہ فریضہ ادا کر سکتی ہیں یا نہیں؟ نئی تنقید کے متعلق انہوں نے یہ کہا کہ ''نئی تنقید کی سب سے نئی بات یہی ہے کہ یہ ادب کی تنقید نہیں بلکہ تنقید کی تنقید ہے۔''(۶) عسکری صاحب کہتے ہیں کہ یہ ادب کا فرض ہے کہ ہمیں ادب سے لطف لینا سکھائے۔اس مقام پر انہوں نے پھر سوال اٹھایا ہے کہ کیا تنقید کی یہ نئی قسم اس مقصد کے لیے اپنا فریضہ ادا کر سکتی ہے؟ ان کو اس فریضے کی ادائیگی پر شک ہے۔ہم یہاں یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر عسکری صاحب ہمارے اس دور میں زندہ ہوتے تو جدید تنقیدی تھیوری کو دیکھ کر وہ کیا کہتے؟ ظاہر ہے تھیوری کی تنقید کو دیکھ کر وہ جاننا چاہتے کہ کیا تھیوری ہمیں ادب سے لطف لینا سکھا سکتی ہے؟ یقینی طور پر اس کا جواب نفی میں ہوتا۔عسکری صاحب ادب اور تنقید کی جن اقدار کے قائل تھے وہ تھیوری کے فروغ کے بعد پس منظر میں چلی گئی ہیں۔اب ادب سے محظوظ ہونے کا تصور کلاسیکی مزاج کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔تھیوری سے ادب کی تفہیم کے نئے رخ پیدا ہوئے ہیں، مگر یہ ادب کی تفہیم سے زیادہ لسانیات کی تفہیم ہے۔ادب اور اس کی جمالیاتی اقدار تھیوری کے افق پر معدوم نظر آتی ہیں۔ادب سے لطف لینے کا تصور تنقید کی پرانی روایت کا حصہ بن گیا ہے۔اب یہ تھیوری کے زندہ مضامین میں شامل نہیں ہے۔

عسکری صاحب اپنے مضمون 'فن برائے فن' میں تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ''فن کی روح جمالیاتی تسکین ہے۔''(۷) ان کا خیال ہے کہ ''شاید کچھ فنکاروں نے نظریاتی طور پر فن برائے فن کے اصول کو تسلیم بھی کر لیا ہو، مگر مجھے عملی طور پر کوئی ایسا معقول فن پارہ نظر نہیں آتا جس نے اس نظریے پر ایمان لانے کے بعد زندگی کے اہم ترین پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا ہو یا ان سے دلچسپی ختم کر دی ہو یا محض جمالیاتی تسکین کا رسیا بن کے رہ گیا ہو۔''(۸) عسکری صاحب کے اس بیان کا مقصد یہ ہے کہ فن برائے فن کے تصور کو ماننے والے ادیب بھی زندگی کے حقائق اور مسائل سے منہ نہیں موڑ سکتے ہیں۔وہ زندگی کے میدان میں برابر موجود رہتے ہیں۔البتہ ادب میں زندگی کے اظہار کے موقع پر ادب کے لیے وہ جمالیاتی سلیقے سے ضرور سوچیں گے۔

عسکری صاحب نے فن برائے فن نظریے کی توضیح کرتے ہوئے جس طرح اس جمالیاتی نظریے کی وکالت کی ہے وہ تنقید میں یادگار حیثیت رکھتی ہے۔ ''جس روایت کی ابتدا فن برائے فن کے نظریے سے ہوئی، اس سے تعلق رکھنے والے فنکاروں کے یہاں ادھر ادھر جو غیر صحت مند عناصر بھی ملتے ہوں ان سے مجھے انکار نہیں، البتہ اس سے انکار ہے کہ یہ روایت مجموعی حیثیت سے عوام یا بہتر زندگی یا حیات محض کی دشمن ہے۔ یا انسانیت کو انحطاط یا موت کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کے برخلاف یہ روایت ایک عظیم الشان تحقیقی مہم کی حیثیت رکھتی ہے جو زندگی کے بنیادی لوازمات کو ڈھونڈنے نکلی ہے اور اس ہمت اور خوداعتمادی کے ساتھ کہ کسی بنے بنائے تصور کا سہارا تک نہ لیا۔ یہ تحریک خیر اور صداقت کے بنیادی وجود سے منکر نہیں ہے، بلکہ ان کا مکمل اثبات چاہتی ہے۔''

یہ معلوم ہوتا ہے کہ سن پچاس کی دہائی کے آخری حصے تک عسکری صاحب کی مذہب سے دلچسپی برائے نام تھی۔ وہ مکمل طور پر مشرقی اور مغربی ادبیات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ مشرقی اور مغربی ادب پر اکثر اظہارِ خیال کرتے رہتے تھے۔ انگریزی سے زیادہ وہ فرانسیسی ادب سے دلچسپی ظاہر کرتے رہتے تھے اور فرانسیسی ادب کے مصادر ان کی ادبی قوتوں کو روشنی عطا کرتے رہتے تھے۔ مگر اسی دہائی کے آخری برسوں میں ان کے ہاں پراسرار طور پر تبدیلی کا خفیف سا عمل نظر آنے لگا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ مذہبیات کے اذکار میں لطف محسوس کرنے لگے تھے۔ جس طرح ایک زمانے میں وہ ادبیات کا ذکر کرتے ہوئے سرشار نظر آیا کرتے تھے اب وہ روحانی مسائل کا تذکرہ کر کے مسرور ہونے لگے تھے۔ جس طرح کوئی مبتدی صوفی اپنی ابتدائی منزلوں میں کسی کوزے کی طرح خشک ہوتا ہے اور جب اسے روحانی نمی ملتی ہے تو وہ تیزی کے ساتھ سیراب ہونے لگتا ہے یہی صورت عسکری صاحب کی تھی۔

اب وہ اردو کے ادیبوں کی جگہ یورپ کے اسلام دوست، نومسلم یا ان مفکرین سے مکالمہ کر رہے تھے جو اسلام یا روحانیات کی تعبیرات میں مصروف نظر آتے تھے۔ اس دور میں حیرت انگیز طور پر وہ ان موضوعات پر تازہ ترین ماخذوں سے مستفید ہوتے رہتے تھے۔ ان کو یہ جستجو رہتی تھی کہ یورپی علماء کے تازہ ترین مباحث تک ان کی رسائی تسلسل کے ساتھ جاری رہنی چاہیے۔ شمس الرحمان فاروقی کے نام لکھے گئے خطوط میں ایسے کئی حوالے دیکھے جاسکتے ہیں جو وہ سانس لیے بغیر تیزی کے ساتھ نئی معلومات کی خبر دیتے ہوئے ملتے ہیں۔ اس زمانے میں رینے گینوں ان کا ہیرو بن چکا تھا۔ رینے گینوں کی تمام تحریروں سے وہ واقفیت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک بار جب ان کو رینے گینوں کے دس ایسے مضمون دستیاب ہوئے کہ جو کتابی شکل میں چھپ نہیں سکے تھے تو انھوں نے فاروقی صاحب کو یہ خوشخبری سنائی۔

سن ساٹھ اور ستر کی دہائی تک ٹی ایس ایلیٹ بہت مقبول نقاد تھا۔ ایلیٹ نے اردو تنقید پر بہت اثر ڈالا تھا۔ اردو تنقید کا شاید ہی کوئی نقاد اس کے اثر سے محفوظ رہ سکا ہو۔ ایلیٹ کے جس مضمون نے اردو تنقید کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ روایت پر ان کا مضمون ہے۔ سن ساٹھ کا شاید ہی کوئی نقاد اس سے محفوظ رہ سکا ہو۔ ایلیٹ کے بارے میں عسکری صاحب نے اس کے رومن کیتھولک ہونے اور اس کے تاریخی شعور کو اہمیت دی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایلیٹ کے نزدیک ادب کا بنیادی مقصد ایک خاص قسم کی ذہنی اور لطیف لذت بہم پہنچانا ہے، جبکہ مشرق کے معاشرے میں ادب وفن کو ایک ذریعہ سمجھا گیا ہے اور اس کا بنیادی مقصد معرفت کا ایک وسیلہ بنتا ہے۔ عسکری صاحب ایلیٹ اور اس کے تصورِ روایت پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ایلیٹ کے لیے روایت وقیع ترین مذہبی رسوم سے لے کر سلام کرنے کے طریقے تک ان سارے افعال کا مجموعہ ہے جو ایک جگہ رہنے والے اور ایک نسل کے لوگوں کے لیے معمول بن گئے ہیں۔ یعنی روایت کا مطلب ہے عادت۔''(۹) عسکری صاحب نے روایت کی تعبیر مذہبی/روحانی حوالے سے کی ہے جو انفس و آفاق پر مشتمل ہے۔ (۱۰) یوں دیکھا جائے تو عسکری نے ایلیٹ کے مذہبی رجحان اور اس کے رومن کیتھولزم پر جو تنقید کی ہے وہ خود ان پر لاگو ہوتی ہے۔ ایلیٹ نے ادبی روایت کی بات کی تھی جبکہ

عسکری نے اس مسئلے کو کنفیوز کرتے ہوئے مذہبی حوالوں کے سپرد کر دیا ہے اور وہ ادبی روایت کی مناسب تشریح و توضیح نہیں کر سکے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ایک دوسرے مضمون 'اردو ادب کی روایت کیا ہے؟' میں یہ کہا تھا کہ معاشرتی روایت، ادبی روایت، دینی روایت الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک بڑی اور واحد وحدت ہے جو سب کی بنیاد ہے اور باقی چھوٹی روایتیں اسی کا حصہ ہیں اور اسی سے نکلی ہیں۔ اسلامی اصطلاح کے مطابق اس بنیادی روایت کا نام ''دین'' ہے۔ (۱۱)

اپنی تنقید کے آخری دور میں محمد حسن عسکری ادب، تنقید، تہذیب، آرٹ اور کلچر کے مباحث کی جگہ مذہبی مسائل کی طرف چلے گئے تھے۔ اسی لیے وہ ادبی روایت کو نظر انداز کر کے دین کی روایت کا تذکرہ کرتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ راں بو کی پیروی میں عسکری صاحب بودیلئر کو شاعروں کا بادشاہ بلکہ خدا سمجھا کرتے تھے۔ راں بو کو وہ جدید دور کا امامِ اعظم اور لوتریاموں کو امامِ ثانی کہا کرتے تھے۔ مگر اب مغرب کو چھوڑ کر وہ مولانا اشرف علی تھانوی، تقی عثمانی، مفتی شفیع اور اکوڑہ خٹک کی پیروی میں آ گئے تھے۔ ان کی زندگی میں یہ بہت بڑا انقلاب تھا۔ ابن عربی سے وہ فیض یاب ہونے لگے تھے اور ان سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ اور شیخ اکبر پر تسلسل کے ساتھ کتابیں تلاش کرتے رہتے تھے۔ مذہب سے ان کی دلچسپی کا قصہ ان کی زبانی سنیے:

> ''دس بارہ سال پہلے تک میں نے کوئی دینی کتاب پڑھی ہی نہیں تھی۔ لیکن فرانس کے ادیبوں نے حضرت ابن عربی کا نام اس طرح لینا شروع کیا کہ بطور فیشن مجھے بھی تجسس ہوا۔ پھر رینے گینوں کی دو ایک کتابیں پڑھ کر اور شوق ہوا۔ چنانچہ ''فصوص الحکم'' اور چند دوسری کتابیں دوسرے حضرات کی پڑھیں۔ یہاں دو باتیں یاد رکھیے۔ ایک تو گینوں کی ابتدائی کتابوں نے یورپ کے لگائے ہوئے بہت سے ذہنی جالے صاف کر دیے تھے۔ دوسرے میں اس زمانے میں بیمار ہو گیا۔ وہ بھی اس طرح کہ چل پھر نہیں سکتا تھا۔ مگر ذہن خوب کام کر رہا تھا۔ اسی وقت گینوں کی سات آٹھ اور کتابیں مل گئیں۔ وہ بھی پڑھتا گیا اور ساتھ ہی حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات بھی۔ اس طرح اللہ تعالٰی نے مدد فرمائی اور غلطیوں سے بچایا۔ اس کے بعد ''فتوحاتِ مکیہ'' پڑھنے کا شوق ہوا۔ عربی تو میں جانتا نہیں اور ترجمہ کسی زبان میں مکمل طور سے ہوا نہیں۔ بہر حال چند ابواب کا اردو ترجمہ ملا تو تمہید میں ہی شیخ اکبر نے لکھا تھا کہ قیامت کے دن تم سے یہ سوال نہیں ہو گا کہ ''فتوحات'' پڑھی تھی یا نہیں۔ وہاں تو یہی پوچھا جائے گا کہ نماز پڑھی تھی یا نہیں۔ یہ پڑھ کر میں نے اسرار و رموز کی فکر چھوڑ دی اور قرآن شریف اور حدیث شریف میں لگ گیا۔ اس کے بعد سے میں نے عموماً ایسی کتابیں پڑھی ہی نہیں۔ جو کتابیں میرے پاس ہیں وہ تبرکاً ہیں۔ یا اس لیے کہ ضرورت پڑے تو ورق گردانی کر لوں۔ اب تو میں بس حضرت مولانا اشرف علی صاحب کے ملفوظات یا وعظ پڑھتا ہوں اور انھوں نے اپنی جن کتابوں کو پڑھنے سے منع کیا ہے انھیں بھی ہاتھ نہیں لگاتا۔ تصوف کے اسرار و رموز کا معاملہ بہت خطرناک ہے۔ ایسی کتابیں پڑھنے کے لیے دینی علوم حاصل کرنے ضروری ہیں۔'' (۱۲)

ہم یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی ۱۹۶۹ء کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب سے شدید لگن کے باوجود ان کے اندر کا ادبی انسان خاموش ضرور ہو گیا تھا مگر وہ فوت نہیں ہوا تھا۔ ان کا یہ پرانا رفیق کبھی کبھی باہر بھی جھانک لیتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء میں شمس الرحمان فاروقی اور مظفر علی سید کے نام خطوط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر کا ادبی انسان دوستوں سے ہم کلام ہونے لگا تھا۔ شاید کبھی کبھار ہی کی بات تھی۔ شمس الرحمان فاروقی، مظفر علی سید کے نام خطوط میں یہ رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔

ان کی زندگی کی آخری کتاب ''جدیدیت یا مغربی گم راہیوں کی تاریخ'' تھی۔ یہ کتاب ان کے انتقال ۱۹۷۸ء کے بعد ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ مذکورہ کتاب میں انہوں نے یورپ کی تہذیبی، سائنسی، ادبی، فلسفیانہ اور معاشرتی ترقی کے ان

ادوار کی مکمل طور پر نفی کی ہے جسے 'جدیدیت' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مغرب زوال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جدید انسان بدترین گم راہیوں کا شکار ہو کے بھٹک گیا ہے۔ مادہ پرستی، سائنسی اور نئے افکار نے اسے بربادی کے آشوب میں مبتلا کر دیا ہے اور مسلسل گم راہی کے راستے پر چل رہا ہے۔ اس گم راہی کے آشوب سے بچنے کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ گذشتہ صدیوں کے غلط راستوں کو چھوڑ دے اور مذہبی عقائد کے راستے کو اختیار کر کے اپنی روحانی زندگی کو اپنی منزل دے دے۔

محمد حسن عسکری کے ادبی کیریر کے آخری دور یعنی سن ۷۰ء کی دہائی میں وہ اپنے اندر ہی اندر چلے گئے تھے۔ ادبی سرگرمیوں کو ترک کر چکے تھے۔ تنقید کا کام چھوڑ دیا تھا۔ اس زمانے میں ان کو مغرب کے زوال اور روحانی زندگی کی شکست نے بہت مایوس کر دیا تھا۔ مغرب کی علمی فتوحات کو وہ شک کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ جدیدیت کا زبردست عہد ان کے لیے بے معنی ہو گیا تھا۔ مغرب کی روشن خیالی میں ان کو تاریکی نظر آنے لگی تھی۔ اس کے بعد کے دور میں مغرب ان کے لیے گم راہیوں کی علامت بن گیا تھا، تب انہوں نے ردِعمل کے طور پر اپنے خیالات قلم بند کیے۔ محمد حسن عسکری کی زندگی میں یہ بڑی تبدیلی اردو ادب کے لیے ایک المیہ نظر آتی ہے۔ اردو ادب کا سب سے بڑا نقاد ادبی دنیا کو تیاگ کر گوشہ نشیں ہو گیا۔ ان کی مصروفیات کا دائرہ گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک ہی رہ گیا تھا، اور اسی حالت میں وہ ۱۹۷۸ء میں فوت ہوئے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد حسن عسکری، سہیل احمد فاروقی (مترجم)، جرا پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء

۲۔ مجموعہ۔ محمد حسن عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۹۴ء، ص ۲۷

۳۔ ایضاً، ص ۷۶۔۷۵ ۴۔ ایضاً، ص ۲۵۷

۵۔ فراق کی تنقید ۶۔ فراق کی تنقید

۷۔ مجموعہ عسکری، ص ۶۰ ۸۔ ایضاً، ص ۶۰

۹۔ ایضاً، ص ۳۶۔۶۳۸ ۱۰۔ ایضاً، ص ۶۴۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۴۵ ۱۲۔ ایضاً، ص ۶۳۔۶۲

معاون کتب

۱۔ اشتیاق احمد، (مرتب)، محمد حسن عسکری: ایک عہد آفریں نقاد، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۵ء

۲۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال، کراچی، ۱۹۹۶ء

۳۔ عزیز ابن الحسن، محمد حسن عسکری: شخصیت و فن، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۲۰۰۷ء